13

اسلامی علوم کا تعارف

اصول فقہ

آیت اللہ شہید استاد مرتضی مطہریؒ

شہید مطہری فاونڈیشن

www.shaheedmutahhari.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب	علم الاصول
مصنف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
مترجم	سید محمد عسکری
سیٹنگ	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (0333-4031233)
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

''شہید مطہری فاؤنڈیشن'' دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور انٹرنیٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''علم الاصول'' شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔بارہا قرآن مجید اور رسول اکرمؐ و آئمہ اطہارؑ کی احادیث میں دین کے بارے میں ''تفقہ'' کا حکم دیا گیا ہے۔ان آیات و احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلام کو اس کے تمام شعبوں میں پوری گہرائی اور بھرپور بصیرت کے ساتھ سمجھیں۔کتابِ ھذا میں اسی طرح کی بحثیں ہیں قارئین حضرات اس سے استفادہ کریں۔

ادارہ ھذا نے اس کتاب کے موضوعات کو مختلف ایرانی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔کتاب کو پاکستان کی عوام کے پسندیدہ خط،فونٹ اور انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ نیٹ پر اَپ لوڈ کرنے والوں کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے۔اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

فہرست مضامین

سبق نمبر ۱ 7
علم اصول کے کلیات 7
مقدمہ 7
اصول فقہ 10
سبق نمبر ۲ 13
فقہ کے مصادر 13
قرآن 14
سنت 16
اجماع 18
عقل 20
سبق نمبر ۳ 21
مختصر تاریخ 21
سبق نمبر ۴ 28
علم اصول کے مسائل 28
ظواہر کتاب کی حجیت 29
سنت کے ظواہر 31
خبر واحد 32
تعادل وتراجیح 32

سبق نمبر ۵ 35
کتاب وسنت کے مشترکہ مسائل 35
بحث اوامر 36
بحث نواہی 37
بحث عام وخاص 38
مطلق ومقید 40
مفاہیم 41
مجمل ومبین 42
ناسخ ومنسوخ 42
سبق نمبر ۶ 44
اجماع وعقل 44
اجماع محصل اور اجماع منقول 45
عقل 46
سبق نمبر ۷ 53
عملی اصول 53
چار عملی اصول 54

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سبق نمبر ا

علم اصول کے کلیات

مقدمہ

ہمارے اس سبق کا موضوع ''علم اصول'' کے کلیات ہیں۔ فقہ اور اصول دو ایسے علم ہیں جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ آئندہ صفحات میں یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان کا ایک دوسرے سے ارتباط اوروابستگی ویسی ہی ہے جیسی وابستگی منطق وفلسفہ کے درمیان پائی جاتی ہے۔ چونکہ علم اصول، ''علم فقہ'' کے مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے اسے ''اصول فقہ'' یعنی فقہ کی بنیاد اور جڑ کہتے ہیں۔

پہلے ان دونوں علموں کی مختصر تعریف بیان کردینا ضروری ہے۔

لغت میں ''فقہ'' کے معنی فہم اور سمجھنا ہیں، البتہ عمیق فہم۔ کائنات کے مسائل کے بارے میں ہمارے معلومات واطلاعات دوقسم کے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارے اطلاعات سطحی ہوتے ہیں اور بعض اوقات عمیق ہوتے ہیں۔ ایک اقتصادی مثال ملاحظہ ہو۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ بہت سی چیزیں چند برس پہلے موجود نہ تھیں آج بازار میں موجود ہیں اور اسی کے برعکس بہت سی چیزیں پہلے

پائی جاتی تھیں لیکن اب دستیاب نہیں ہیں۔ کچھ چیزوں کی قیمت میں روزبروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور بعض چیزوں کی قیمتیں اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہیں۔

یہ اطلاعات جنہیں ہر شخص حاصل کرسکتا ہے، سطحی اطلاعات ہیں لیکن ان ہی مسائل کے بارے میں بعض لوگ عمیق اطلاع رکھتے ہیں۔ ظاہری سطح سے گزر کر مسائل کی گہرائی میں اترتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان مسائل کی جڑ تک پہنچ چکے ہوتے ہیں یعنی انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں چیز کی فراوانی یا فلاں سامان کی کمیابی کا سبب کیا ہے، اشیاء کی گرانی یا ارزانی کے پیچھے کون سے اسباب کارفرما ہیں؟ قیمتوں میں اضافہ کی وجہ کیا ہے۔ یہ اسباب وعلل کس قدر ضروری وناگزیر ہیں اور کس حد تک ان کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔

اگر اقتصادی مسائل میں کسی کے اطلاعات اس حد کو پہنچ جائیں کہ سطحی مشاہدات سے گزر کر مسائل کی گہرائی میں اتر جائیں تو اسے اقتصادی مسائل میں ''متفقہ'' کہا جائے گا۔

بارہا قرآن مجید اور رسول اکرمؐ وآئمہ اطہارؑ کی احادیث میں دین کے بارے میں ''تفقہ'' کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات واحادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اسلام کو اس کے تمام شعبوں میں پوری گہرائی اور بھرپور بصیرت کے ساتھ سمجھیں۔ دین کے بارے میں ''تفقہ'' کا اسلامی نظریہ کسی خاص شعبہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کے تمام شعبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے چاہے اس کا تعلق عقائد اور اسلامی تصور کائنات سے ہو یا اخلاقیات وتربیت اسلامی سے۔ یا اسلامی سماجیات، اسلامی

عبادات ، اسلامی شہری قوانین اور فردی و اجتماعی زندگی میں اسلام کے مخصوص آداب و رسوم سے ہو۔لیکن دوسری ہجری کے بعد سے مسلمانوں کے درمیان لفظ ''فقہ'' ایک مخصوص اصطلاح بن گیا اور خاص شعبہ سے مخصوص ہو گیا جسے ''فقہ الاسلام'' یا ''فقہ الاستنباط'' کا نام دیا جاسکتا ہے اور اس سے مراد ''متعلقہ مصادر و ماخذ کی روشنی میں اسلام کے عملی احکام وقوانین کا عمیق استنباط اور پوری گہرائی کے ساتھ انہیں سمجھنا'' ہے۔

اسلامی احکام وقوانین پیش آنے والے تمام مسائل اور رونما ہونے والے تمام واقعات کے بارے میں پورے جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں ہوئے ہیں۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ جو جو مسائل انسان کو پیش آنے والے ہیں ان کی ہر ہر فرد اور ہر ہر واقعہ کا حکم اسلام نے بیان کر دیا ہو اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ حادثات و واقعات کی شکلیں مختلف و لامتناہی ہیں۔ اسلام نے ان تمام مسائل و واقعات کے احکام وقوانین کچھ اصول، کلیات اور قواعد کی شکل میں بیان کر دیئے ہیں۔

جب فقیہ کسی جزئی حادثہ یا مسئلہ کا حکم بیان کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان معتبر مصادر و مآخذ کی طرف رجوع کرے جنہیں ہم آئندہ ذکر کریں گے اور تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کرے۔یہی وجہ ہے کہ فقاہت، عمیق، گہرے اور بھرپور فہم و ادراک کے ہمراہ ہوتی ہے۔

فقہاء فقہ کی تعریف کرتے وقت یہ عبارت پیش کرتے ہیں:

هو العلم بالاحكام الشرعية الفرعية عن

ادلتها التفصيلية

شریعت اسلام کے فرعی احکام (یعنی اعتقادی و تربیتی احکام نہیں بلکہ صرف عملی احکام) کا اس کے تفصیلی دلائل و مصادر (جنہیں ہم بعد میں بیان کریں گے) کے ہمراہ جاننا فقہ ہے۔

اصول فقہ

ایک فقیہ کے لیے بطور مقدمہ، بہت سے علوم میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے اور وہ علوم یہ ہیں:

۱۔عربی ادب: یعنی نحو، صرف، لغت، معانی، بیان، بدیع۔کیونکہ قرآن و حدیث عربی زبان میں ہیں اور عربی زبان و ادب میں (کم از کم رائج حد تک) مہارت حاصل کیے بغیر قرآن و حدیث سے استفادہ ناممکن ہے۔

۲۔تفسیر قرآن: چونکہ قرآن مجید فقہ کا ایک اہم مصدر ہے اور فقیہ اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہے۔لہٰذا فقیہ کے لیے تفسیری علوم سے اجمالی واقفیت ضروری ہے۔

۳۔منطق: جس علم میں استدلال سے کام لیا جاتا ہے وہ منطق کا محتاج ہوتا ہے۔لہٰذا فقیہ کو بھی کم وبیش علم منطق سے آشنا ہونا چاہیے۔

۴۔علم حدیث: فقیہ کو حدیث شناسی اور اقسام حدیث سے واقف نیز مشق و ممارست کی کثرت کے باعث حدیث کی زبان سے آشنا ہونا چاہیے۔

۵۔علم رجال: یعنی راویوں کی شناخت ہم بعد میں یہ بتائیں گے کہ حدیث کی کتابوں میں درج ہر حدیث کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی چھان بین ضروری ہے اور علم رجال احادیث کی اسناد (راویوں) کی جانچ پڑتال ہی کے لیے ہے۔

۶۔علم اصول فقہ: وہ اہم ترین علم جسے فقہ کے مقدمہ کے طور پر حاصل کرنا ضروری ہے۔علم اصول فقہ ہے۔ یہ دلچسپ علم مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم کا ایک حصہ ہے۔علم اصول، درحقیقت، دستور استنباط کا علم ہے۔ یہ علم ہمیں فقہ میں فقہی مصادر کے ذریعہ استنباط کا صحیح طریقہ سکھاتا ہے۔ اسی لیے علم منطق کی طرح، علم اصول بھی ایک ''دستوری'' علم ہے اور وہ ''علم'' سے زیادہ ''فن'' سے قریب ہے یعنی اس علم میں کچھ ''ہونا چاہیے'' سے بحث و گفتگو کی جاتی ہے نہ کہ ''ہے'' کے بارے میں۔

بعضوں کا خیال ہے کہ علم فقہ میں علم اصول کے مسائل اسی طرح سے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے ایک علم کے قیاسات کے دونوں مقدمے (مبادی) اس علم میں استعمال کیے جاتے ہیں اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں علم اصول کے مسائل ونتائج علم فقہ کے 'کبریٰ' ہیں۔

لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے جس طرح منطق کے مسائل، فلسفہ کے لیے ''کبریٰ'' نہیں بنتے اسی طرح اصول کے مسائل بھی فقہ کے لیے ''کبریٰ'' نہیں ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے جسے یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

چونکہ ممکن ہے کہ فقہی مصادر و مآخذ کی طرف کچھ خاص طریقوں سے

رجوع کیا جائے اور اس کا نتیجہ غلط استنباطوں کی شکل میں نکلے جو حقیقت اور شارع اسلام کے واقعی نظریہ کے برخلاف ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک خاص علم میں یقینی و قطعی نقلی و عقلی دلیلوں کے ذریعہ یہ تحقیق کی جائے کہ فقہی مصادر و مآخذ سے استفادہ اور اسلامی احکام کے استنباط کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ علم اصول اسی جہت کو بیان کرتا ہے۔

صدر اسلام ہی سے مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرا لفظ بھی رائج رہا ہے جو تقریباً لفظ ''فقہ'' ہی کا معنی دیتا ہے۔ وہ لفظ ''اجتہاد'' ہے۔

آج ہمارے یہاں ''فقیہ'' اور ''مجتہد'' دونوں ایک یہ معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔لفظ ''اجتہاد'' کا مادہ ''جہد'' (جیم پر پیش) ہے۔جس کا مطلب انتھک کوشش ہے۔ فقیہ کو مجتہد اس لیے کہتے ہیں کہ اسے احکام وقوانین کے استنباط میں بھرپور اور انتھک کوشش کرنی چاہیے۔

لفظ ''استنباط'' بھی تقریباً اجتہاد وفقہ کا معنے دیتا ہے، یہ لفظ مادہ ''نبط'' سے مشتق ہوا ہے جس کا معنی زمین کے نیچے سے پانی نکالنا ہے، گویا فقہا نے احکام کے استنباط میں اپنی سعی و کوشش کو کنواں کھودنے والوں کے کام سے تشبیہ دی ہے کہ وہ مختلف تہوں کے نیچے سے احکام کا آب زلال نکالتے ہیں۔

سبق نمبر ۲

فقہ کے مصادر

پہلے سبق میں ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ علم اصول فقہ ہمیں فقہ کے اصلی مصادر کے ذریعہ شرعی احکام کے استنباط کا صحیح طور وطریقہ سکھاتا ہے۔اب ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ مصادر کیا ہیں اور کتنے ہیں؟ اور کیا تمام اسلامی مذاہب ان مصادر کے متعلق، ہر جہت سے اتفاق نظر رکھتے ہیں یا ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؟ ہم پہلے فقہ کے مصادر کے بارے میں شیعہ علماء وفقہا کا نظریہ پیش کریں گے اور پھر ان مصادر کی تشریح و وضاحت کرتے ہوئے دوسرے اسلامی مذاہب کے علماء کے نظریات بھی ضمناً بیان کریں گے۔

شیعہ علماء کی نظر میں (اخباری نامی ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا جس کے بارے میں ہم بعد میں وضاحت دیں گے) فقہ کے مصادر چار ہیں:

۱۔ خدا کی کتاب، قرآن مجید (اب اس کے بعد علم اصول کے ماہرین اور فقہاء کی تعبیر کے مطابق اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم بھی اسے صرف ''کتاب'' کے نام سے یاد کریں گے۔

۲۔ سنت، یعنی پیغمبرؐ وامامؑ کا قول، فعل اور تقریر (تائید)۔

۳۔ اجماع۔

۴۔ عقل۔

فقہاء اور اصولیوں (علم اصول کے ماہرین) کی زبان میں یہ چار مصادر ''ادلہ اربعہ'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ علم اصول، ادلہ اربعہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔اب ہر ایک مصدر کی علیحدہ علیحدہ تشریح وتوضیح ضروری ہے۔اسی کے ذیل میں دیگر اسلامی مذاہب اور شیعہ اخباریوں کے نقطہ نظر کی وضاحت بھی ہوگی۔ہم اپنی گفتگو کا آغاز خدا کی کتاب سے کرتے ہیں۔

قرآن

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید اسلامی احکام وقوانین کا اولین مصدر ہے۔البتہ قرآن مجید کی ساری آیتیں صرف عملی احکام وقوانین ہی کے بارے میں نہیں ہیں۔قرآن مجید مین سیکڑوں قسم کے مسائل سے بحث وگفتگو ہوئی ہے۔لیکن قرآن مجید کی چھ ہزار چھ سو ساٹھ آیتوں میں سے تقریباً پانچ سو آیتیں یعنی قرآن کا تقریباً ۱۲/۱ حصہ صرف عملی احکام سے مخصوص ہے۔علماء اسلام نے ان پانچ سو آیتوں کے بارے میں بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔

ہم شیعوں کے یہاں اس سلسلہ کی مشہور ترین کتاب ملا احمد اردبیلی کی ''آیات الاحکام'' ہے۔ملا احمد اپنے دور کے مشہور ترین زاہد، متقی اور مجتہد تھے اور آپ مقدس اردبیلی کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔مقدس اردبیلی دسویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں اور شاہ عباس کبیر صفوی کے ہم عصر ہیں۔اس سلسلہ کی

دوسری کتاب، آٹھویں صدی کے اختتام اورنویں صدی کی ابتداء کے علماء سے تعلق رکھنے والے فاضل مقداد دسیوری حلی کی ''کنزالعرفان'' ہے۔ اہل سنت نے بھی آیات الاحکام سے متعلق کتابیں تحریر کی ہیں۔

صدر اسلام ہی سے مسلمانوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ اسلام احکام کے استنباط کے لیے سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن ایران میں صفویوں کے ظہور کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی تحریک پیدا ہوئی اور ایک نیا فرقہ ابھرا جس نے عام لوگوں کے لیے قرآن سے استفادہ پر پابندی عائد کردی۔ان کا دعویٰ تھا کہ قرآن سے صرف نبی و امام ہی کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور صرف وہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ان کے علاوہ تمام افراد کوصرف اخبار واحادیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس گروہ نے جس طرح قرآن سے استفادہ پر پابندی عائد کی اسی طرح اجماع وعقل کی طرف رجوع کو بھی جائز نہیں سمجھا۔کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ اجماع، اہل سنت کی ایجاد ہے اور عقل چونکہ جائز الخطا ہے اس لیے غلطی کا امکان ہے لہٰذا اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ واحد مصدر جس کی طرف رجوع کرنا چاہیے اخبار واحادیث ہیں۔اسی لیے اس گروہ کو''اخباری'' کہا جاتا ہے۔

یہ گروہ قران کی طرف رجوع اور عقل و اجماع کی حجیت سے انکار کے ساتھ ہی ساتھ سرے سے اجتہاد ہی کا منکر ہوگیا۔کیونکہ اجتہاد کا مطلب جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کسی مسئلہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا اور پوری توجہ کے ساتھ استنباط کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ عقل استعمال کیے بغیر کسی چیز کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا ناممکن ہے۔

اس گروہ نے یہ نظریہ قائم کرلیا کہ عوام کو چاہیے کہ وہ مجتہدوں کے وسیلہ کے بغیر، براہ راست خود ہی اخبار واحادیث کی طرف رجوع کریں اور اس سے حکم حاصل کریں بالکل اسی طرح جس طرح عوام رسالہ عملیہ (توضیح المسائل) سے اپنے مسائل حاصل کرتے ہیں۔

اس گروہ کے پیشوا ''امین استرآبادی'' ہیں، جن کا تذکرہ،کلیات منطق، کی بحث میں، قیاس کی اہمیت کے ذیل میں گزر چکا ہے۔انہوں نے اپنے نظریات ''فوائدالمدنیہ'' نامی اپنی مشہور ومعروف کتاب میں بیان کیے ہیں۔موصوف ایرانی ہیں لیکن برسوں مکہ ومدینہ میں قیام پذیر رہے ہیں۔

اخباریوں کے ظہور اور ایران کے جنوبی شہروں، خلیج فارس کے جزیروں نیز عراق کے بعض شہروں میں بہت سے لوگوں کی جانب سے اس فکر کی حمایت نے جمود وانحطاط کو جنم دیا۔لیکن خوش قسمتی سے اعلیٰ مقام مجتہدوں کی جاں فشانی اور بھرپور مزاحمت کے باعث اخباریوں کی پیشروی ماند پڑگئی ان کی تعداد گھٹنے لگی اور اب گوشہ وکنار میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

سنت

سنت یعنی معصوم کا قول، فعل یا تائید۔ ظاہر ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات میں کوئی حکم بیان ہوا ہو یا یہ ثابت ہوجائے کہ حضورؐ نے عملی طور پر کسی دینی فریضہ کو کس طرح سے انجام دیا ہے یا یہ معلوم ہوجائے کہ دوسرے افراد دینی فرائض کو ایک خاص شکل میں آپ کے سامنے انجام دیتے تھے اور آپ نے ان کی تائید فرمائی ہے۔یعنی آپ نے اپنی خاموشی کے ذریعہ ان کے عمل کی صحت کی تصدیق فرمائی ہے تو یہ

ایک فقیہ کے لیے ان چیزوں کو سند قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

سنت اور اس کی حجیت کے سلسلہ میں کلی طور پر کوئی بحث نہیں ہے۔ اس کا کوئی مخالف نہیں ہے۔ سنت کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ دو جہتوں میں ہے۔ ایک یہ کہ آیا صرف پیغمبر اسلامؐ کی سنت حجت ہے، یا آئمہ معصومینؑ کی سنت بھی حجت ہے۔ اہل سنت صرف پیغمبر اسلامؐ کی سنت کو حجت مانتے ہیں لیکن ہم شیعہ، قرآن مجید کے بعض آیات اور رسول اکرمؐ کی متواتر حدیثوں کے مطابق جنہیں خود اہل سنت نے نقل کیا ہے منجملہ پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث کہ: ''میں اپنے بعد تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: کتاب خدا اور میری عترت، جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ آئمہ اطہارؑ کے قول، فعل اور تائید کو بھی سند جانتے ہیں۔

اختلاف کی دوسری جہت یہ ہے کہ رسول خداؐ اور آئمہ اطہارؑ سے مروی سنت، کبھی قطعی و متواتر ہوتی ہے اور کبھی ظنی یا دوسرے لفظوں میں ''خبر واحد'' ہوتی ہے۔ اختلاف یہ ہے کہ آیا رسول خداؐ کی غیر قطعی سنتوں کی طرف بھی رجوع کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

یہ وہ مقام ہے جہاں نظریات افراط و تفریط کے شکار ہوگئے ہیں۔ ابوحنیفہ جیسے کچھ افراد نے تمام حدیثوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ابوحنیفہ، رسول خداؐ سے مروی تمام حدیثوں میں سے صرف سترہ حدیثوں کو قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ ضعیف حدیثوں پر بھی بھروسہ کرتے رہے ہیں۔

لیکن شیعہ علماء کا نظریہ ہے کہ صرف صحیح اور موثق حدیثوں ہی پر اعتماد کیا

جا سکتا ہے، یعنی اگر حدیث کا راوی شیعہ اور عادل ہو یا کم از کم سچا اور بھروسہ کے لائق ہے تو اس کی روایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے پس حدیث کے راویوں کا پہچاننا اور ان کے بارے میں تحقیق کرنا ضروری ہے، اگر یہ ثابت ہو گیا کہ ایک حدیث کے تمام راوی سچے اور بھروسہ کے قابل ہیں تو پھر ان کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے عمل کریں گے۔

بہت سے سنی علماء کا بھی یہی خیال ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے درمیان ''علم رجال''، یعنی راوی شناسی کے علم نے جنم لیا لیکن شیعوں کے یہاں اخباریوں کا جن کا ذکر گزر چکا ہے کہنا ہے کہ حدیثوں کو صحیح، موثق اور ضعیف میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کے خیال میں تمام حدیثیں خاص طور سے چار کتابوں (کتب اربعہ) یعنی **کافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام** اور **استبصار** میں مندرج سب حدیثیں معتبر ہیں۔ اہل سنت کے یہاں بھی بعض افراد اس قسم کے افراطی نظریات کے حامل رہے ہیں۔

اجماع

اجماع یعنی کسی مسئلہ میں مسلمان علماء کا اتفاق نظر۔ شیعہ علماء کے نقطہ نظر سے اجماع کے حجت و معتبر ہونے کا سبب یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان کسی ایک مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اسے شارع اسلام کا حکم سمجھا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ مسلمان، خود اپنی طرف سے کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں۔ لہٰذا (شیعہ علماء کی نظر میں) صرف وہ اجماع حجت ہے جو پیغمبرؐ یا امامؑ کے قول کا انکشاف کرتا ہو۔

مثلاً اگر یہ بات ثابت ہوجائے کہ کسی ایک مسئلہ میں پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ کے تمام مسلمان بلا استثناء اتفاق نظر رکھتے تھے اور سب ایک قسم کا عمل کرتے تھے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کا حکم خود پیغمبر اکرمؐ سے حاصل کیا ہے۔ یا آئمہ اطہارؑ میں سے کسی امام کے تمام صحابی جو صرف آئمہ اطہارؑ ہی کے احکام کی پیروی کرتے تھے کسی ایک مسئلہ پر متفق ہوجائیں تو اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کو اپنے امامؑ کے دبستان ہی سے سیکھا ہے پس شیعی نقطۂ نظر سے وہ اجماع حجت ہے جس کا سرا پیغمبر اسلامؐ (یا آئمہ اطہارؑ) کے قول سے ملتا ہو۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

الف۔ شیعی نقطہ نظر سے صرف پیغمبرؐ یا امامؑ کے ہم عصر علماء کا اجماع حجت ہے پس اگر آج ہمارے دور میں تمام علماء اسلام کسی ایک مسئلہ پر اجماع کرلیں تو وہ بعد کے علماء کے لیے حجت نہ ہوگا۔

ب۔ شیعی نقطہ نظر سے، اجماع بذات خود کوئی حقیقت و اصالت نہیں رکھتا یعنی اجماع اس لیے حجت نہیں ہے کہ وہ اجماع اور اتفاق نظر ہے۔ بلکہ اس لیے حجت ہے کہ وہ پیغمبرؐ یا امامؑ کے قول کا کاشف ہے۔

لیکن سنی علماء کی نظر میں اجماع بذات خود حقیقت و اصالت رکھتا ہے یعنی اگر مسلم علماء (یا اہل حل وعقد) کسی مسئلہ پر بھی زمانہ میں (چاہے وہ ہمارا یہ زمانہ ہی کیوں نہ ہو) متفق ہوجائیں تو یقیناً ان کا فیصلہ صحیح ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ اس امت کے بعض افراد غلطی پر ہوں اور بعض نہ ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب کسی غلط فیصلہ پر متفق ہوجائیں۔

عقل

شیعوں کے نقطہ سے عقل کی حجیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کسی مسئلہ میں قطعی و یقینی حکم دے دے تو چونکہ وہ قطعی و یقینی حکم ہے لہٰذا حجت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شرعی مسائل، عقلی احکام کے دائرہ میں آتے ہیں جو عقل اس کے بارے میں کوئی قطعی حکم دے سکے؟ ہم اس کا جواب اس وقت دیں گے جب علم اصول کے مسائل کے کلیات کے بارے میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

شیعوں کا اخباری گروہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوچکا ہے عقل کو کسی بھی حال میں حجت نہیں مانتا۔ اہل سنت کے فقہی مذاہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے درمیان ابوحنیفہ، قیاس کو چوتھی دلیل مانتے ہیں۔ حنفیوں کی نظر میں فقہ کے مصادر چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ قیاس وہی ہے جسے منطق میں تمثیل کہتے ہیں۔

مالکی و حنبلی خاص طور سے حنبلی حضرات، قیاس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، لیکن شافعی حضرات نے اپنے پیشوا محمد بن ادریس شافعی کے اتباع میں بین بین موقف اختیار کیا ہے یعنی حنفیوں سے زیادہ حدیث کو اور مالکیوں و حنبلیوں سے زیادہ قیاس کو اہمیت دیتے ہیں۔

قدیم فقہاء کی اصطلاح میں قیاس کو ''رائے'' یا ''اجتہاد بالرائے'' بھی کہا جاتا رہا ہے۔ اسلام نے جو کلیات بیان فرمائے ہیں ان تمام مسائل کا جواب موجود ہے لہٰذا شیعی نقطہ نظر سے قیاس پر عمل کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

سبق نمبر ۳

مختصر تاریخ

وہ طالب علم جو کسی علم کو حاصل یا اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس علم کی پیدائش، اس علم کے موجد، اس علم میں ہونے والی تبدیلیوں، اس علم کے ماہرین، اس علم کے مشاہیر اور اس علم سے متعلق مشہور ومعتبر کتابوں کی تاریخ سے واقف ہو۔

علم اصول، وہ علم ہے جس نے اسلامی ثقافت کی آغوش میں آنکھیں کھولی ہیں اور اسی کے دامن میں پروان چڑھا ہے۔مشہور یہ ہے کہ علم اصول کے موجد محمد بن ادریس شافعی ہیں۔ابن خلدون اپنے مشہور ومعروف مقدمہ میں،علوم وصنائع کے باب میں لکھتے ہیں:

> وہ پہلا شخص جس نے علم اصول کے بارے میں کتاب لکھی، شافعی تھے۔موصوف نے اپنے مشہور کتاب ''الرسالہ'' کے نام سے لکھی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں اوامر، نواہی، بیان، خبر، نسخ اور منصوص العلۃ قیاس سے بحث وگفتگو کی ہے۔ ان کے بعد حنفی علماء نے اس سلسلہ میں کتابیں تحریر کیں اور وسیع پیمانہ پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔

لیکن جیسا کہ سید حسن صدر اعلی مقامہ نے اپنی نفیس کتاب ''تاسیس الشیعۃ لعلوم الاسلام'' میں تحریر فرمایا ہے:

> اوامر، نواہی، عام، خاص وغیرہ جیسے علم اصول کے مسائل شافعی سے پہلے بھی موضوع بحث بنے ہوئے تھے اور شیعہ علماء نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ شافعی وہ پہلے شخص ہیں جس نے اپنے زمانہ میں درپیش اصول کے تمام مسائل کے بارہ میں ایک جامع رسالہ تحریر کیا ہے۔

بعض مستشرقوں کا خیال ہے کہ شیعوں کے یہاں اجتہاد، سنیوں کے دوسو سال بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ آئمہ اطہارؑ کے زمانہ میں شیعوں کو اجتہاد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ چنانچہ انہیں اجتہاد کے مقدمات کی بھی ضرورت نہ تھی لیکن یہ نظریہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

اجتہاد نے اپنے صحیح معنے میں یعنی اصول کی طرف فروع کی بازگشت اور فروع پر اصول کی مطابقت شیعوں کے درمیان آئمہ اطہارؑ کے زمانہ ہی سے رائج رہا ہے۔آئمہ اطہارؑ اپنے اصحاب کو تفریع واجتہاد کا حکم دیا کرتے تھے۔[1]

البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ مختلف مسائل وموضوعات میں آئمہ اطہارؑ

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے ''مکتب تشیع'' کے تیسرے شمارہ میں شہید مطہری کے مقالہ ''اجتہاد و اسلام'' اور ''ہزارہ شیخ طوسی'' کی دوسری جلد میں موصوف ہی کے مقالہ ''الہامی از شیخ الطائفہ'' کا مطالعہ فرمائیں۔

سے منقول روایتوں کی کثرت کے باعث شیعہ فقہ کا دامن مالا مال ہو گیا ہے اور اسے اجتہادی کوششوں کی کم تر ہی ضرورت پیش آئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود شیعہ اپنے کو فقہ و اجتہاد سے بے نیاز نہیں سمجھتے تھے آئمہ اطہارؑ خاص طور سے اپنے اکابر صحابہ کو اجتہادی کوششوں کا حکم دیتے تھے۔

ہماری معتبر کتابوں میں آئمہ اطہارؑ کا یہ قول موجود ہے:

علینا القاء الاصول و علیکم ان تفرعوا

ہمارا فریضہ اصول و کلیات بیان کرنا ہے اور ان اصول و کلیات کو فروع و جزئیات پر منطبق کرنا تمہارا فریضہ ہے۔

شیعہ علماء میں وہ پہلی اہم اور برجستہ شخصیت جس نے علم اصول میں کتابیں تالیف کیں اور اصول میں ان کے نظریات صدیوں تک بحث و گفتگو کا موضوع بنے رہے، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی ذات ہے۔ سید مرتضیٰ نے علم اصول میں بہت سے کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی مشہور ترین کتاب ''الذریعہ'' ہے۔

سید مرتضیٰ، نہج البلاغہ کو جمع کرنے والے سید رضی کے بھائی ہیں، سید مرتضیٰ چوتھی صدی ہجری کے اختتام اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے ۴۳۶ھ میں وفات پائی ہے۔ سید مرتضیٰ مشہور شیعہ متکلم شیخ مفید (وفات ۴۱۳ھ) کے شاگرد ہیں۔ شیخ مفید، شیخ صدوق ابن بابویہ (وفات ۳۸۱ھ) کے شاگرد ہیں۔ شیخ صدوق، شہر رے میں دفن ہیں۔

سید مرتضیٰ کے بعد وہ مشہور و معروف شخصیت جس نے علم اصول کے بارے میں کتاب لکھی اور ان کے نظریات تین چار صدی تک غیر معمولی طور پر

چھائے رہے، شیخ ابوجعفر طوسی (وفات ۴۶۰ھ) ہیں۔

شیخ طوسی، سید مرتضیٰ کے شاگرد ہیں۔ کچھ عرصہ شیخ مفید کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ ایک ہزار سال سے زائد قدیمی، نجف اشرف کا حوزہ علمیہ اسی عظیم شخصیت کے ہاتھوں تاسیس ہوا ہے۔ شیخ طوسی کی اصولی کتاب کا نام ''عدۃ الاصول ہے''۔

ایک دوسری شخصیت جس کے نظریات، علم اصول میں مشہور ہوئے صاحب ''معالم الاصول'' ہیں۔ آپ کا نام شیخ حسن ہے اور صاحب ''شرح لمعہ'' شہید ثانی کے فرزند ہیں۔

''معالم''، علم اصول کی مشہور کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور آج بھی دینی علوم کے طالب علموں کے نصاب میں شامل ہے۔ صاحب معالم نے ۱۰۱۱ھ میں وفات پائی ہے۔

اس سلسلے کی ایک اور اہم شخصیت، وحید بہبہانی مرحوم کی ذات والاصفات ہے۔ آپ نے ۱۱۱۸ھ میں آنکھ کھولی اور ۱۲۰۸ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وحید بہبہانی مرحوم کی ایک اہمیت یہ ہے کہ آپ نے ذوق اجتہاد و فقاہت سے معمور بہت سے شاگردوں کی تربیت کی ہے۔ جیسے سید مہدی بحر العلوم، شیخ جعفر کاشف الغطا، میرزا ابوالقاسم گیلانی المعروف بہ میرزای قمی وغیرہ۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ آپ نے اخباریوں کے خلاف بڑا سخت اور پیہم علمی جہاد کیا ہے۔ آپ کے زمانہ میں اخباریوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا لیکن آپ کی

کوششوں سے انہیں منھ کی کھانی پڑی۔ اخباریت پر فقاہت و اجتہاد کی کامیابی بڑی حد تک وحید بہبہانی کی کوششوں اور محنتوں کی رہین منت ہے۔

ایک اور شخصیت جس نے علم اصول کو آگے بڑھایا میرزا ابوالقاسم گیلانی قمی مرحوم ہیں۔ موصوف وحید بہبہانی کے شاگرد اور فتح علی شاہ قاچار کے ہم عصر ہیں۔ آپ غیر معمولی عزت واحترام کے مالک تھے۔ ''قوانین الاصول'' جو برسوں دینی مدرسوں کے نصاب تعلیم کا جز رہی ہے اور آج بھی مورد استفادہ ہے۔ اسی عظیم شخصیت کا ایک کارنامہ ہے۔

اس آخری صدی میں وہ اہم ترین شخصیت جس کے سامنے سب کے چراغ ماند پڑ گئے اور اس نے علم اصول کو ایک نئے مرحلہ میں داخل کر دیا۔ وہ استاد المتاخرین حاج شیخ مرتضیٰ انصاری ہیں۔

اس عظیم شخص نے ۱۲۱۴ھ میں شہر دزفول میں آنکھ ھولی۔ اسلامی علوم کی ابتدائی تعلیم اور ایک حد تک فقہ واصول پڑھنے کے بعد صاحب نظر علماء کی تلاش میں عراق وایران کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور ان علماء سے استفادہ کیا اور آخر کار نجف اشرف میں قیام پذیر ہو گئے۔ ۱۲۶۶ھ میں صاحب جواہر کی وفات کے بعد، شیعوں کی مرجعیت و زعامت کا منصب آپ کو سونپ دیا گیا۔ ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کے افکار ونظریات آج بھی بحث وگفتگو میں مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔

آپ کے بعد آنے والے تمام علماء آپ ہی کے دبستان کے پیرو ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسا دبستان وجود میں نہیں آیا ہے جو آپ کے مکتب فکر کو مکمل طور پر

دگرگوں کر سکے۔ لیکن آپ کے دبستان کے شاگردوں نے آپ ہی کے مکتب فکر کی بنیاد پر کچھ ایسے نظریات پیش کیے ہیں جن سے بعض اوقات آپ کے نظریات ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔ شیخ انصاری کی دو مشہور کتابیں ہیں، ایک علم اصول میں ہے جس کا نام ''فرائد الاصول'' ہے اور دوسری فقہ میں ''مکاسب'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں آج بھی دینی علوم کے مدرسوں میں (اعلیٰ درجوں کے لیے) درسی کتابوں کا حصہ ہیں۔

شیخ انصاری کے مکتب کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ومعروف صاحب ''کفایۃ الاصول'' آخوند ملا محمد کاظم خراسانی ہیں۔ آخوند خراسانی مرحوم کے افکار ونظریات دینی مدرسوں میں ہمیشہ موضوع بحث رہتے ہیں۔

یہ عظیم شخص وہی ہے جس نے مشروطیت کا فتویٰ دیا اور ایران میں نظام مشروطہ کی برقراری میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ تاریخ مشروطہ سے مربوط کتابوں میں آپ کا نام ہمیشہ لیا جاتا ہے۔ آپ نے ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

آخوند خراسانی مرحوم کے بعد بھی علم اصول میں اچھے خاصے نئے نئے افکار ونظریات وجود میں آئے ہیں اور بعض نظریات تو غیر معمولی تحقیق و دقت نظر کے حامل ہیں۔

اسلامی علوم کے درمیان کسی بھی علم میں اتنی ردوبدل نہیں ہوئی ہے جتنی علم اصول میں تبدیلی آتی رہی ہے اور آج بھی ایسی نمایاں شخصیتیں موجود ہیں جو اس علم میں صاحب نظر مانی جاتی ہیں۔

علم اصول، چونکہ علمی و ذہنی محاسبات سے سروکار رکھتا ہے اور اس میں

تحقیق وجستجو بہت زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا یہ ایک شیریں ودلچسپ علم ہے اور طالب علم کے ذہن کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔علم اصول، فکری ورزش اور ذہن کی مشق کے لحاظ سے فلسفہ ومنطق کی صف میں شمار ہوتا ہے۔علوم قدیمہ کے طلبا اپنی فکر ونظر کی گہرائی کے سلسلہ میں اسی علم اصول کے رہین منت ہیں۔

سبق نمبر ۴

علم اصول کے مسائل

ہم یہاں علم اصول کے مسائل سے محترم وعزیز طالب علموں کی آگاہی کے لیے کچھ کلیات ذکر کررہے ہیں لیکن اصولیوں کے یہاں رائج ترتیب کی پیروی نہیں کریں گے بلکہ ان مطالب کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ جسے ہم خود بہتر سمجھتے ہیں پیش کریں گے۔

ہم پہلے بھی یہ بتا چکے ہیں کہ علم اصول ایک دستوری علم ہے۔یعنی یہ علم ہمیں اصلی مصادر سے احکام کے صحیح استنباط کا طریقہ سکھاتا ہے۔لہٰذا علم اصول کے تمام مسائل ان ہی چار مصادر سے مربوط ہیں جنہیں گزشتہ دروس میں بیان کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ علم اصول کے مسائل یا کتاب (قرآن) سے مربوط ہیں یا سنت (حدیث) سے یا دونوں سے یا اجماع سے اور یا عقل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اب میں یہ عرض کروں گا کہ ممکن ہے کہ ہمارے سامنے کچھ ایسے مقامات بھی آجائیں جن کے اسلامی احکام کو ہم ان چار مصادر میں سے کسی کے ذیعہ استنباط نہ کرسکیں، یعنی استنباط کی راہیں ہمارے لیے مسدود ہوں۔شارع اسلام نے اس مقام پر بھی خاموشی اختیار نہیں کی ہے اور کچھ عملی قواعد وفرائض ہمارے لیے مقرر

کیے ہیں جنہیں ہم حکم ظاہری کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔

حکم واقعی کے استنباط سے مایوسی کے بعد عملی و ظاہری فریضہ کے حاصل کرنے کے سلسلہ میں بھی ہم ان قواعد سے استفادہ کے طور طریقے اور اصول و دستور سیکھنے کے محتاج ہیں۔

لہٰذا علم اصول جو ایک ''دستوری علم'' ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم، متعلقہ مصادر سے واقعی شرعی احکام کے صحیح استنباط کے دستور سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری قسم، واقعی احکام کے استنباط سے مایوسی کی صورت میں کچھ قواعد سے صحیح استفادہ کے اصول و دستور سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم پہلی قسم کو ''استنباطی اصول'' اور دوسری قسم کو ''عملی اصول'' کا نام دے سکتے ہیں اور چونکہ استنباطی اصول یا کتاب یا سنت یا اجماع یا عقل کے ذریعہ استنباط سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا استنباطی اصول کے مسائل چار بحثوں میں تقسیم ہوں گے۔ ہم اپنی بحث کا آغاز کتاب (قرآن) سے کر رہے ہیں۔

ظواہر کتاب کی حجیت

علم اصول میں قرآن سے مخصوص بحثیں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ قرآن سے متعلق اکثر بحثیں کتاب و سنت کے درمیان مشترک ہیں۔ وہ واحد بحث جو صرف اور صرف قرآن سے تعلق رکھتی ہے۔ ''ظواہر کی حجیت'' کی بحث ہے یعنی قرآن کا ظاہر اس سے قطع نظر کہ کسی حدیث کے ذریعہ اس کی تفسیر ہوئی ہو حجت ہے یا نہیں؟ اور فقیہ اسے سند قرار دے سکتا ہے یا نہیں؟

بظاہر یہ بات بڑی عجیب نظر آتی ہے کہ اصولیوں نے یہ بحث کیوں چھیڑی

ہے کیا یہ بھی کوئی شک و شبہ کا مقام ہے کہ فقیہ، آیات قرآن کے ظواہر کو سند بنا سکتا ہے یا نہیں؟

شیعہ اصولوں نے یہ بحث اخباریوں کے اعتراضات کا جواب دینے کی غرض سے چھیڑی ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اخباریوں کا خیال ہے کہ معصومینؑ کے سوا کسی کو قرآن سے استفادہ و استنباط کا حق نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کو قرآن سے ہمیشہ بالواسطہ یعنی اہل بیتؑ کی احادیث و روایات کے ذریعہ مستفید ہونا چاہیے۔

اخباری اس سلسلہ میں ان احادیث کو دلیل بناتے ہیں جن میں ''تفسیر بالرائے'' سے روکا گیا ہے۔ اخباریوں کا دعویٰ ہے کہ ہر آیت کا معنی حدیث سے پوچھنا چاہیے۔ بالفرض اگر کسی آیت کا ظاہر کسی بات پر دلالت کرتا ہو لیکن حدیث اس کے برخلاف مفہوم پر دلالت کرتی ہو تو ہمیں چاہیے کہ حدیث کے مفہوم کو اپنا لیں اور یہ کہہ دیں کہ آیت کا واقعی معنی ہمیں نہیں معلوم۔ اس طرح احادیث و روایات، قرآنی آیات کے لیے معیار اور کسوٹی ہیں۔

لیکن اصولیوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان، قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کا حق رکھتے ہیں جس تفسیر بالرائے سے منع کیا گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی فکر و نظر کے ذریعہ قرآن کا معنی سمجھنے کا حق نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کو اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض و مقاصد کی بنیاد پر تفسیر نہیں کرنا چاہیے۔

اصولیوں کا کہنا ہے کہ خود قرآن واضح الفاظ میں لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ

قرآن میں ''تدبر'' کریں اوراس کے بلند مفاہیم میں اپنے طائرفکرکوقوت پرواز عطا کریں۔ پس لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی طاقت وتوانائی بھرقرآنی آیات کی بنیادوں کوخود براہ راست حاصل کریں اوراس کے مطابق عمل کریں۔

اس کے علاوہ متواتر روایتوں میں ہے کہ پیغمبراکرمؐ اور آئمہ اطہارؑ ان جعلی وخودساختہ حدیثوں سے بے حد رنجیدہ ہوتے تھے جوان کے نام سے مشہور ہوتی تھیں چنانچہ ان جعلی حدیثوں کی روک تھام کے لیے انہوں نے انہیں ''قرآن کے سامنے پیش کرنے'' کا اصول وضع کیا اورفرمایا:

> جب بھی ہم سے منسوب کوئی حدیث تمہارے سامنے آئے، اسے قرآن کے روبروپیش کرو، اگرحدیث قرآن کے خلاف ہوتو یقین کرلوکہ وہ ہماری حدیث نہیں ہے اور اسے دیوار پردے مارو۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخباریوں کے دعوے کے برخلاف، احادیث قرآن کے لیے معیارومقیاس نہیں ہیں بلکہ خودقرآن، احادیث وروایات کی کسوٹی ہے۔

سنت کے ظواہر

ظواہرسنت کی حجیت کے بارے میں کسی نے کوئی بحث نہیں کی ہے۔لیکن سنت جس سے مراد وہ احادیث وروایات ہیں جوپیغمبرؐ یاامامؑ کےقول،فعل یاتقریر کی حکایت کرتے ہیں۔اس کے سلسلہ میں بھی دواہم باتیں پائی جاتی ہیں جن کے متعلق

اصولی علماء بحث وگفتگوکرتے ہیں۔

ایک خبرواحد کی حجیت کا مسئلہ ہے اوردوسرا، احادیث وآیات کے ٹکراؤ کا معاملہ ہے۔اسی لیے علم اصول میں دواہم اور وسیع فصلوں کا اضافہ ہوا ہے ایک ''خبرواحد'' کے نام سے اوردوسری ''تعادل وتراجیح'' کے عنوان سے۔

خبرواحد

خبرواحد یعنی وہ روایت جوپیغمبرؐ یاامامؑ سے نقل ہوئی ہولیکن اس کا راوی صرف ایک شخص ہو یا چندافراد ہوں لیکن وہ تواتر کی حد تک نہ پہنچی ہو یعنی وہ اس مرحلہ میں نہ ہو کہ یقین کا باعث بن سکے۔کیا اس طرح کی روایتوں کو استنباط کی بنیادقرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اصولیوں کا نظریہ ہے کہ اگرراوی عادل ہوں یا کم ازکم ان کی صداقت کا یقین ہوتوان کی نقل کردہ روایتوں کو سند بنایا جاسکتا ہے۔اس دعوے کے سلسلہ میں اصولیوں کی ایک دلیل آیت ''نبا'' ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: ان جائکم فاسق بنباء فتبینوا۔ یعنی اگرکوئی فاسق تمہیں کوئی خبر دے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو، تحقیق کیے بغیراس پرعمل نہ کرو۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خبر دینے والا عادل اور لائق اعتماد ہوتو اس کی خبر پر (تحقیق کیے بغیر) عمل کرو۔ پس اس آیت کا مفہوم، خبرواحد کی حجیت کی دلیل ہے۔

تعادل وتراجیح

اب رہا احادیث روایات کے ٹکراؤ کا مسئلہ تواکثرایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک

مسئلہ میں اخبار وروایات ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں، مثلاً نماز پنجگانہ کی تیسری اور چوتھی رکعات میں تسبیحات اربعہ تین بار پڑھی جانی چاہیے یا ایک ہی مرتبہ کافی ہے۔ بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تین مرتبہ پڑھنا ضروری ہے اور ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ ایک ہی مرتبہ کافی ہے یا یہ مسئلہ کہ انسانی فضلہ کی کھاد بیچنا جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں بھی روایتیں مختلف ہیں۔

اس قسم کی روایتوں کے سلسلہ میں کیا کرنا چاہیے؟ آیا یہ کہہ دیں کہ **اذا تعارضا تساقطا** یعنی ٹکراؤ کی صورت میں دونوں سے دست بردار ہوجائیں۔ گویا کوئی روایت ہی موجود نہیں ہے؟ یا ہمیں اختیار پر عمل کرتے ہوئے جو روایت احتیاط کے مطابق ہو اسے قبول کرلیں۔ (تسبیحات اربعہ کے مسئلہ میں اس روایت پر عمل کریں جو تین دفعہ پڑھنا ضروری سمجھتی ہے اور انسانی فضلہ کی کھاد کی خرید وفروخت کے مسئلہ میں اس روایت پر عمل کریں جو اسے جائز نہیں سمجھتی) یا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی ہے؟

اصولی علما ثابت کرتے ہیں کہ پہلے جہاں تک ہوسکے مختلف روایتوں کو جمع کیا جائے (یعنی ممکنہ اور معقول تاویلوں کے ذریعہ ان کے تضاد کو برطرف کیا جائے) **الجمع مهما امكن اولى من الطرح** جہاں تک ہوسکے روایتوں کو جمع کرنا ان کے ٹھکرانے سے بہتر ہے۔ اگر ان کے درمیان اجتماع امکان پذیر نہ ہوتو یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر کسی اعتبار سے (مثلا سند کے اعتبار سے) یا علما کے درمیان مشہور ہونے کے اعتبار سے یا تقیہ کے مخالف ہونے کے اعتبار سے) ترجیح رکھتی ہے یا نہیں؟

اگر کوئی روایت ترجیح رکھتی ہے تو اسی روایت کو اپنالیں گے اور دوسری کو ٹھکرادیں گے اور اگر دونوں ہر اعتبار سے مساوی ہوں اور ان میں کسی قسم کی کوئی ترجیح نہ پائی جاتی ہو تو ہمیں اختیار ہے کہ جس روایت پر چاہیں عمل کریں۔

خود حدیثوں میں بھی یہ بات موجود ہے کہ اگر دو حدیثیں آپس میں ٹکرا جائیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ روایتیں جو حدیثوں کے ٹکراؤ کی مشکل حل کرنے کا طریقہ ہمیں سکھاتی ہیں وہی ہیں جو ''علاجیہ اخبار'' کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔

اصولیوں نے اخبار وروایات کے ٹکراؤ کے سلسلہ میں اپنا نظریہ ان ہی ''اخبار علاجیہ'' کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ اصولیوں نے اس باب کا نام جو اس مسئلہ کے متعلق بحث وگفتگو کرتا ہے **تعادل و تراجیح** رکھا ہے۔

تعادل یعنی مساوات و برابری۔ تراجیح، ترجیح کی جمع ہے اور اس کا معنی ترجیحات ہے یعنی وہ باب جس میں متعارض روایتوں کے ہم پلہ ہونے یا ایک دوسرے پر ترجیح رکھنے کے سلسلہ میں بحث وگفتگو کی جاتی ہے۔

مذکورہ گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حجیت ظواہر کا تعلق قرآن مجید سے ہے اور خبر واحد کی حجیت نیز دلیلوں کے ٹکراؤ کا مسئلہ سنت سے مربوط ہے۔ علم اصول میں کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو کتاب وسنت کے درمیان مشترک ہیں۔ یہاں ہم ان کے بارے میں بحث وگفتگو شروع کرتے ہیں۔

سبق نمبر ۵

کتاب وسنت کے مشترکہ مسائل

ہم نے گزشتہ درس میں کچھ اصولی مسائل کی اشارہ کیا، جن کا تعلق ''کتاب'' کے امتیازات یا ''سنت'' کے مختصات سے تھا۔ دوسرے درس کے آخر میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ کچھ اصولی مسائل کا تعلق کتاب سے بھی ہے اور سنت سے بھی۔ اس درس میں ہم انہی مشترک مسائل پر گفتگو کریں گے جنہیں ''مباحث مشترک'' قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

یہ مشترک مسائل حسب ذیل ہیں:

الف۔ بحث اوامر

ب۔ بحث نواحی

ج۔ بحث عام وخاص

د۔ بحث مطلق ومقید

ھ۔ بحث مفاہیم

و۔ بحث مجمل ومبین

ز۔ بحث ناسخ ومنسوخ

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں اصطلاحات سے واقفیت کی حد تک مختصر وضاحت کرتے ہیں۔

بحث اوامر

اوامر، امر کی جمع ہے۔ امر یعنی فرمان۔ عربی زبان اور تمام زبانوں میں جو افعال پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ''فعل'' امر بھی ہے۔ مثلاً فارسی میں ''بدان'' (اردو میں ''جان لو'') عربی میں ''اِعْلَمْ'' فعل مراد ہے۔

قرآن وسنت کی بہت سی تعبیریں فعل امر کی شکل میں ہیں۔ یہاں فقیہ کے سامنے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب اصولیوں کو دینا ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ آیا امر وجوب پر دلالت کرتا ہے یا استحباب پر یا نہ وجوب پر نہ استحباب پر؟ امر فوریت پر دلالت کرتا ہے یا (تراخی) تاخیر پر؟ امر، صرف ایک دفعہ فعل کے انجام دیئے جانے پر دلالت کرتا ہے یا بار بار کیے جانے پر؟

مثلاً اس آیت شریفہ میں ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ط

(توبہ ۹: ۱۰۳)

مسلمانوں کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کیجیے، اس طرح آپ انہیں پاک و پاکیزہ بنا دیں گے اور ان کے لیے دعا کیجیے کیونکہ آپ کی دعا ان کے سکون واطمینان کا

باعث ہے۔

اس آیت میں لفظ صَلِّ کا معنیٰ 'دعا کرو' یا 'درود بھیجو' ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دعا کرنا جس کا حکم صیغہ امر کے ذریعہ دیا گیا ہے، واجب ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں آیا امر یہاں پر وجوب کی دلالت کررہا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ یہ حکم فوری ہے یا نہیں؟ یعنی آیا الٰہی ٹیکس (زکوٰۃ) لینے کے فوراً بعد دعا کرنا واجب ہے یا اگر کچھ تاخیر بھی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے، تیسرے یہ کہ آیا ایک مرتبہ ہی دعا کردینا کافی ہے یا بار بار دعا کرنا ضروری ہے؟

اصولیوں نے ان تمام سوالات کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے لیکن ہم یہاں اس سے زیادہ بحث نہیں کرسکتے۔ جو لوگ فقہ واصول میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے مزید تفصیلات سے واقف ہوجائیں گے۔

بحث نواہی

نہی، امر کے مقابلہ میں ہے اور اس کا مطلب کسی چیز سے روکنا ہے، مثلاً اگر اردو میں کہیں ''شراب نہ پیو'' یا عربی میں کہیں ''لا تشرب الخمر'' تو یہ نہی ہے۔ نہی کے متعلق بھی یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ نہی حرمت پر دلالت کرتی ہے یا کراہت پر یا نہ حرمت پر نہ کراہت پر بلکہ وہ صرف اتنا بتاتی ہے کہ مورد نظر شے ناپسند ہے، اب رہی یہ بات کہ ناپسندیدگی حرمت کی حد تک ہے کہ اس کا مرتکب سزاوعقوبت کا مستحق ہو یا کہ یہ صرف کراہت کی حد تک ہے، جس کا مرتکب سزاوعقوبت کا مستحق نہیں ہے۔ یہ چیزیں نہی کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ اسی

طرح آیا نہی ابدیت ودوام پر دلالت کرتی ہے یعنی کبھی بھی وہ فعل انجام نہیں دینا چاہیے یا یہ کہ صرف ممانعت کے لزوم پر دلالت کرتی ہے چاہے صرف ایک مختصر سی مدت ہی میں سہی۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب علم اصول فراہم کرتا ہے۔

بحث عام وخاص

ہم دیوانی وفوجداری قوانین میں دیکھتے ہیں کہ وہ ایک قانون عمومی اور کلی شکل میں بیان کرتے ہیں جو اس قانون کے موضوع کے تحت آنے والے تمام افراد کو شامل ہوتا ہے۔

لیکن بعد میں دوسرے مقام پر اسی موضوع کے تحت کچھ افراد کے بارے میں ایک ایسا حکم بیان کرتے ہیں جو اس کلی وعمومی قانون کے خلاف ہے۔

یہاں کیا کرنا چاہیے؟ آیا ان دونوں قوانین کو ایک دوسرے سے متصادم سمجھیں یا یہ کہ چونکہ ان دونوں میں سے ایک قانون دوسرے کی نسبت عام ہے اور دوسرا خاص ہے۔ لہٰذا اس خاص کو قانون عام کے لیے ایک استثنا قرار دیں اور انہیں آپس میں متصادم نہ سمجھیں؟

مثلاً قرآن مجید میں ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْۤءٍ ؕ

(البقرہ:۲۲۸)

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اپنے آپ کو روکے رکھیں (اور شادی نہ کریں

یعنی عدہ رکھیں)۔

اب یہ فرض کریں کہ کسی معتبر حدیث میں آیا ہو کہ اگر کوئی عورت کسی مرد سے عقد کر لے اور ہم بستری سے پہلے ہی اسے طلاق مل جائے تو اس کے لیے عدہ رکھنا ضروری نہیں ہے۔

یہاں کیا کیا جائے؟ آیا اس حدیث کو قرآن سے متصادم سمجھیں اور نتیجہ میں آئمہ کے حکم کے مطابق اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں؟ یا نہیں، یہ حدیث درحقیقت اس آیت کی مفسر ہے اور اس کے بعض مصادیق میں استثناء کی حیثیت رکھتی ہے اور ان دونوں میں کسی قسم کا تصادم و تعارض نہیں پایا جاتا۔

یقیناً یہی دوسرا نظریہ صحیح ہے کیونکہ انسانوں کی گفتگو کا معمول یہی ہے کہ وہ پہلے ایک قانون کو کلی شکل میں بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآن نے بھی انسانوں کے درمیان رائج انداز گفتگو کے مطابق انسان کو مورد خطاب قرار دیا ہے۔ اور دوسری طرف سے خود قرآن نے پیغمبرؐ کی حدیث کو معتبر جانا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر:۷)

یعنی پیغمبرؐ جو کچھ تمہیں دیں لے لو اور جس چیز سے تمہیں منع کریں اس سے دور رہو۔

لہٰذا اس قسم کے مقامات پر خاص کو عام کے لیے استثناء سمجھیں گے اور کہیں گے کہ عام کو خاص کے ذریعہ تخصیص دیتے ہیں، عام کے لیے

"مخصص" ہے۔

مطلق و مقید

مطلق و مقید بھی عام و خاص ہی جیسا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ عام و خاص افراد کے سلسلہ میں ہے اور مطلق و مقید، حالات و صفات کے بارے میں ہے۔ عام و خاص وہاں ہے جہاں کلی کے بہت سے افراد ہوں اور بعض اوقات لامتناہی ہوں اور اس کے بعض افراد کسی خاص دلیل کے ذریعہ اس عموم سے خارج کر دیئے جائیں، لیکن مطلق و مقید کا تعلق فریضہ و تکلیف کی ماہیت سے ہے اور مکلف اس ماہیت کو وجود میں لانے کا پابند ہے۔

جس ماہیت کو ایجاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگر اس میں کوئی کاص قید نہ ہو تو وہ مطلق ہے اور اگر اس میں کوئی مخصوص قید لگی ہو تو وہ مقید ہے۔

مثلاً وہی مثال جو پہلے ذکر ہو چکی ہے اس میں پیغمبر اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ لیتے وقت ان کے لیے دعا کریں (صل علیھم) یہ حکم اس لحاظ سے کہ مثلاً یہ دعا بلند آواز سے کی جائے یا آہستہ سے مجمع میں کی جائے یا خود زکوٰۃ دینے والے کی موجودگی ہی کافی ہے۔ مطلق ہے۔

اب اگر قرآن یا معتبر حدیث کی کوئی دلیل موجود نہ ہو جو مذکورہ بالا قیود کو بیان کرتی ہو تو وصل علیھم کے اطلاق پر عمل کریں گے، یعنی ہمیں یہ اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں انجام دیں۔ لیکن اگر کوئی معتبر دلیل مل جائے جو یہ کہے کہ مثلاً یہ عمل با آواز بلند انجام دیا جانا چاہیے یا سب کے سامنے یا مسجد میں دعا ہونی چاہیے تو ہم یہاں اس مطلق کو مقید کر دیں گے یعنی اس دلیل کو صل علیھم کے لیے مقید

قرار دیں گے۔ اس عمل کا نام تقیید ہے۔

مفاہیم

اصطلاح میں لفظ ''مفہوم'' ''منطوق'' کے مقابلہ میں ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص کہتا ہے: اگر میرے ساتھ میرے گھر آیئے گا تو میں آپ کو فلاں کتاب دوں گا۔'' یہ جملہ درحقیقت ایک جملہ کے بجائے دو جملہ ہے:

الف۔ اگر میرے ساتھ میرے گھر آیئے گا تو میں وہ کتاب دوں گا۔

ب۔ اگر میرے ساتھ میرے گھر نہ آیئے گا تو وہ کتاب نہیں دوں گا۔

پس اس جملے میں دو رابطے پائے جاتے ہیں، مثبت اور منفی۔ ساتھ آنے اور کتاب دینے کے درمیان مثبت رابطہ خود جملہ میں موجود ہے اور متکلم نے اس کا تلفظ و نطق کیا ہے۔ اسی لیے اسے منطوق کہتے ہیں لیکن منفی رابطہ نطق و لفظ کی صورت میں موجود نہیں ہے بلکہ عرف اس جملہ سے یہ مفہوم سمجھتی ہے، اسی لیے اسے مفہوم کہتے ہیں۔

ہم خبر واحد کی حجیت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں کہ اصولیوں نے آیت ''نباء'' سے جو یہ کہتی ہے اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا (۴۹:۷) (اگر کوئی فاسق تمہیں کوئی خبر دے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو، تحقیق کیے بغیر اس پر عمل نہ کرو)۔ راوی کے عادل ہونے کی صورت میں خبر واحد کی حجیت کو ثابت کیا ہے۔ اور یہ کام آیت شریفہ کے مفہوم سے انجام پایا ہے۔ آیت کا منطوق یہ ہے کہ فاسق کی خبر نہ مانو لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ عادل کی خبر مان لو۔

مجمل و مبین

مجمل و مبین کی بحث کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ مقصد یہ ہے کہ شارع کی زبان میں بعض اوقات کچھ ایسی تعبیریں ملتی ہیں جن کا مفہوم اور مقصود غیر واضح ہے جیسے ''غنا'' کا مفہوم، لیکن دوسری دلیل میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو اس کے مفہوم کو واضح کرتی ہیں چنانچہ اس کے ''مبین'' کے ''مجمل'' کا ابہام برطرف کیا جا سکتا ہے۔

عام طور سے اہل ادب، پیشوا یا ان ادب کے کلام میں بعض مجمل تعبیروں سے دوچار ہوتے ہیں اور اس کا مفہوم سمجھنے سے عاجز ہوتے ہیں لیکن بعد میں واضح قرائن فراہم کر کے ابہام کو دور کرتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ

قرآن میں کچھ ایسے احکام بھی ہیں جو وقتی و عارضی تھے یعنی کچھ دنوں بعد دوسرا حکم آ گیا جس نے پہلے حکم کو لغو کر دیا۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ اگر شوہر دار عورتیں زنا کرتی ہیں تو انہیں گھر میں قید کر دیا جائے یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ مقرر کرے۔ بعد میں ان کے لیے یہ راستہ مقرر ہوا کہ حکم آیا: اگر شادی شدہ مرد یا عورتیں زنا کی مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار (رجم) کر دیا جائے۔

یا مثلاً پہلے یہ حکم تھا کہ ماہ رمضان میں حتیٰ رات میں بھی لوگ اپنی بیویوں سے ہم بستری نہ کریں لیکن بعد میں یہ حکم لغو ہو گیا اور افطار کے بعد ہم

بستری کی اجازت مل گئی۔

ایک فقیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناسخ ومنسوخ کو پہچانے اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کرے۔ نسخ کے سلسلہ میں بہت سے مسائل ہیں جنہیں اصولیوں نے بیان کیا ہے۔

سبق نمبر ۶

اجماع وعقل

فقہ کا ایک ماخذ اجماع ہے، علم اصول میں اجماع کی حجیت، اس کی دلیلوں اور اس سے استفادہ کے طریقوں کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

اجماع سے متعلق ایک بحث یہ ہے کہ اس کی حجیت کی دلیل کیا ہے؟ اہل سنت کا دعویٰ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: **لا تجتمع امتی علی خطاء** یعنی میری پوری امت کسی غلط و باطل امر پر متفق نہیں ہوسکتی۔ پس اگر ساری امت کسی ایک مسئلہ پر متفق ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بات صحیح ہے۔

اس حدیث کے مطابق امت کا مجموعہ خود پیغمبرؐ کی حیثیت رکھتا ہے اور غلطی سے معصوم ہے ساری امت کا قول، پیغمبر کے قول کا درجہ رکھتا ہے۔ اتفاق نظر کی صورت میں امت کا مجموعہ معصوم ہے۔

اہل سنت کے نقطۂ نظر سے چونکہ امت کا مجموعہ معصوم ہے لہٰذا جب کبھی اس قسم کا اتفاق نظر ہوجائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے پیغمبر اسلامؐ پر وحی الٰہی نازل ہوئی ہو۔

لیکن شیعہ، اولاً رسول اکرمؐ کی اس حدیث کو مسلم نہیں مانتے۔ ثانیاً وہ کہتے

ہیں: یہ صحیح ہے کہ تمام امت کا ضلالت وگمراہی پر مجتمع ہوجانا محال ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ ہمیشہ ایک معصوم فرد امت کے درمیان موجود ہے۔ امت کا مجموعہ اگر خطا سے معصوم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ امت کی ایک فرد معصوم ہے۔ نہ یہ کہ ''غیر معصوموں'' کے اجتماع سے ایک ''معصوم'' بن جائے گا۔ ثالثاً شاید بطور عادت بھی یہ ممکن نہ ہو کہ ساری امت متفق علیہ طور پر غلطی میں ہو، لیکن فقہ یا کلام کی کتابوں میں جس چیز کو اجماع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ امت کا اجماع نہیں ہے بلکہ صرف ایک خاص گروہ کا اجماع ہے البتہ وہ گروہ، اہل حل وعقد یعنی امت کے علماء کا گروہ ہے۔ وہ بھی امت کے تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے بلکہ امت کے ایک فرقہ کے علماء کا اتفاق نظر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیعہ، اجماع کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی اہل سنت دیتے ہیں۔ شیعہ، اجماع کو صرف اسی حد تک معتبر جانتے ہیں جہاں تک وہ حدیث کا انکشاف کرے۔

شیعہ نقطۂ نظر سے جب کبھی کسی مسئلہ میں کوئی دلیل موجود نہ ہو لیکن ہمیں یہ معلوم ہو کہ پیغمبرؐ یا آئمہؑ کے وہ تمام یا بہت سے صحابہ جو صرف پیغمبرؐ وامامؑ ہی کے حکم پر عمل کرتے تھے انہوں نے ایک مخصوص طریقہ سے عمل کیا ہے تو اس سے ہم پر یہ منکشف ہوگا کہ اس مسئلہ کے بارے میں پیغمبرؐ یا امامؑ کا کوئی حکم موجود تھا جو ہم تک نہیں پہنچ سکا ہے (لیکن وہ اصحاب اس سے واقف تھے اور اسی حکم کی بنیاد پر انہوں نے عمل کیا ہے)۔

اجماع محصل اور اجماع منقول

اجماع، چاہے وہ اس شکل میں ہو جیسے اہل سنت نے مانا ہے یا جیسے شیعوں

نے قبول کیا ہے۔ دو قسموں کا ہے: یا محصل ہے یا منقول، اجماع محصل سے مراد وہ اجماع ہے جسے خود مجتہد نے رسول خداؐ یا آئمہؑ کے اصحاب یا عصر آئمہؑ سے نزدیک لوگوں کے عقائد ونظریات کی تاریخ کی چھان بین کر کے براہ راست حاصل کیا ہو۔

اجماع منقول سے مراد وہ اجماع ہے جس سے مجتہد براہ راست باخبر نہ ہو بلکہ دوسروں نے خبر دی ہو کہ یہ مسئلہ، اجماعی ہے۔ اجماع محصل یقیناً حجت ہے لیکن اجماع منقول کے نقل ہونے سے اگر یقین حاصل نہ ہو تو وہ لائق اعتماد نہیں ہے۔ اسی بنا پر خبر واحد کے ذریعہ نقل ہونے والا اجماع منقول حجت نہیں ہے۔ اگرچہ خبر واحد کے ذریعہ نقل ہونے والی سنت (حدیث) حجت ہے۔

عقل

احکام کے چار مآخذ میں سے ایک عقل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہم بعض اوقات کوئی شرعی حکم عقلی دلیل کے ذریعہ کشف کرتے ہیں یعنی عقلی استدلال و برھان کے ذریعہ ہم یہ انکشاف کرتے ہیں کہ فلاں مورد میں فلاں وجوبی یا تحریمی حکم موجود ہے یا فلاں حکم کیسا ہے اور کیسا نہیں ہے۔

عقل کی حجیت خود عقل کے حکم سے بھی ثابت ہے (آفتاب آمد دلیل آفتاب) اور شریعت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ بنیادی طور پر ہم شرع اور اصول دین کی حقانیت عقلی حکم کے ذریعہ ہی ثابت کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شرعی نقطہ سے ہم عقل کو حجت نہ مانیں۔

اصولیوں نے ''حجیت قطع'' یعنی یقینی علم کی حجیت کے نام سے ایک فصل قائم کی ہے جس میں انہوں نے اس سلسلہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اخباری

حضرات، عقل کی حجیت کے منکر ہیں لیکن ان کی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

عقل سے مربوط، اصولی مسائل دو قسم کے ہیں: ایک قسم، احکام کے معیار و بنیاد یا دوسرے لفظوں میں ''فلسفہ احکام'' سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری قسم کا تعلق احکام کے لوازم سے ہے۔

پہلی قسم کی توضیح یہ ہے کہ: ایک اسلامی مسلمہ خاص طور سے ہم شیعوں کے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ شرعی احکام، کچھ واقعی صالح و مفاسد کے تابع ہیں یعنی شرعی حکم کا سبب و علت ایک ایسی مصلحت ہے جس کا حاصل کرنا ضروری ہے اور ہر شرعی نہی کا باعث ایک ایسا فساد ہے جس سے اجتناب واجب ہے۔

خداوند عالم نے انسان کو بعض واقعی مصلحتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے جن میں اس کی فلاح و بہبود پوشیدہ ہے کچھ امور کو واجب و مستحب قرار دیا ہے اور بشر کو کچھ برائیوں اور فساد سے دور رکھنے کے لیے بعض کاموں سے روکا ہے۔ اگر وہ فساد اور مصلحتیں نہ ہوتیں تو کوئی امر ہوتا اور نہ کوئی نہی۔ اور یہ مفاسد و مصالح یا دوسرے لفظوں میں یہ حکمتیں کچھ اس طرح کی ہیں کہ اگر انسان کی عقل ان کا پتہ لگالے تو وہی حکم کرے جو شرع نے کیا ہے۔

یہی وجہ ہے ''اصولی علماء اور اسی طرح متکلمین کہتے ہیں کہ چونکہ شرعی احکام حکمتوں، مصلحتوں اور فسادوں کے تابع ہیں، چاہے ان مصالح و مفاسد کا تعلق جسم سے ہو یا روح سے فرد سے ہو معاشرہ سے، حیات فانی سے ہو یا حیات جاوید سے۔ پس جہاں کہیں بھی وہ حکمتیں موجود ہوں اس کے متناسب شرعی حکم بھی موجود ہوگا اور جہاں کہیں وہ حکمتیں موجود نہ ہوں گی شرعی حکم بھی موجود نہ ہوگا۔

اب اگر یہ فرض کریں کہ کسی خاص مورد میں شرعی حکم نقل (قرآن و حدیث) کے ذریعہ ہم تک نہ پہنچا ہو لیکن اگر عقل پورے یقین و اطمینان کے ساتھ کسی خاص حکمت کا پتہ لگالے تو حکم شارع کا بھی انکشاف کر لیتی ہے۔ درحقیقت عقل اس مقام پر اس طرح منطقی صغریٰ و کبریٰ تشکیل دیتی ہے:

۱۔ فلاں مورد میں فلاں واجب الحصول مصلحت موجود ہے۔ (صغریٰ)

۲۔ جہاں کہیں واجب الحصول مصلحت موجود ہو یقیناً شارع اس سے لاپرواہی نہیں برتتا ہے بلکہ اس کے حصول کا حکم دے گا۔ (کبریٰ)

۳۔ پس اس مورد میں حکم شرع یہ ہے کہ اسے ضرور بجالایا جائے۔

مثلاً شارع کے زمانہ میں افیون اور اس کی لت کا وجود نہ تھا اور افیون کے بارے میں نقلی (قرآن و حدیث پر مبنی) دلیلوں میں ہمیں کوئی مخصوص دلیل نظر نہیں آتی لیکن حسی و تجربی دلیلوں سے افیون کی لت کے نقصانات و مفاسد معلوم ہو چکے ہیں پس ہمیں یہاں اپنی عقل و علم کے ذریعہ افیون کے سلسلہ میں ایک معیار یعنی واجب الاجتناب فساد ہاتھ آگیا ہے، چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جو چیز انسان کے لیے مضر و نقصان دہ ہو شرعی نقطۂ نظر سے حرام ہے، لہٰذا حکم کریں گے کہ افیون کی لت حرام ہے۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سگریٹ کینسر کا مرض پیدا کرتا ہے تو ایک مجتہد حکمِ عقل کی بنیاد پر حکم کرے گا کہ سگریٹ شرعاً حرام ہے۔

متکلمین و اصولیین، عقل و شرح کے تلازم کو ''قاعدہ ملازمہ'' کے نام سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: **کل ما حکم به العقل حکم به الشرع** یعنی جو

حکم عقل دے گی وہی حکم شرع بھی دے گی۔

لیکن یہ اس صورت میں ہے جب عقل کسی لازم العمل مصلحت یا واجب الاجتناب فساد کا پورے یقین کے ساتھ پتہ لگالے اور شک وشبہ کے بغیر یقینی طور پر واقعی معیار و بنیاد حاصل کرلے ورنہ صرف ظن وگمان، اندازہ وتخمینہ کی بنیاد پر اسے حکمِ عقل نہیں کہا جا سکتا۔ قیاس اسی لیے باطل ہے کہ وہ ظنی وخیالی ہے نہ کہ عقلی و یقینی۔ جب ہم یقینی معیار و ''مناط'' حاصل کرلیتے ہیں تو اس کا نام ''تنقیح مناط'' رکھتے ہیں۔

اسی کے برعکس جب عقل احکام کا معیار ومناط حاصل نہیں کر پاتی لیکن یہ دیکھتی ہے کہ شارع نے اس سلسلہ میں ایک حکم دیا ہے تو وہ حکم کرتی ہے کہ یقیناً یہاں کوئی مصلحت موجود ہے ورنہ شارع اس کا حکم نہ دیتے۔ پس عقل جس طرح سے واقعی مصلحتوں کے انکشاف سے شروع حکم کشف کرتی ہے اس طرح شرعی حکم کے انکشاف سے واقع مصلحتوں کے وجود کا پتہ لگاتی ہے۔

لہٰذا جس طرح کہتے ہیں: کل ما حکم به العقل حکم به الشرع. یہ بھی کہتے ہیں: کل ما حکم به الشرع حکم به العقل

اب رہی دوسری قسم، یعنی احکام کے لوازم، ہر ذی شعور وعقلمند حاکم کا ہر حکم فطری طور پر کچھ لوازم کا حامل ہوتا ہے جس کے بارے میں عقل کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا فلاں حکم کا لازمہ فلاں حکم ہے یا نہیں، یا فلاں حکم کا لازمہ فلاں حکم کی نفی ہے یا نہیں؟

مثلاً اگر کسی چیز کا حکم دیا جائے۔ جیسے حج، اور حج کے کچھ مقدمات

ہیں جیسے پاسپورٹ بنوانا، ٹکٹ لینا اور شاید پیسہ تبدیل کروانا وغیرہ تو کیا حج کے حکم کا لازمہ ان مقدمات کا بھی حکم ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں آیا کسی چیز کے واجب ہونے کا لازمہ اس کے مقدمات کا بھی واجب ہونا ہے؟

محرمات کی صورت حال کیا ہے؟ کیا کسی چیز کے حرام ہونے کا لازمہ اس کے مقدمات کی حرمت بھی ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ۔ اگر دو ایسے واجب ہوں جنہیں ایک ہی وقت میں بجالانا ممکن نہ ہو بلکہ ان میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور ہوں تو ایسی صورت میں اگر ان میں سے کوئی ایک اہم ہو تو یقیناً اسی اہم کو انتخاب کریں گے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارا فریضہ ''اہم'' کو بجالانا ہے تو کیا یہ ''غیر اہم'' کے وجوب کے بالکل ساقط ہوجانے کا باعث ہوگا؟ یا یہ کہ ''غیر اہم'' کا وجوب اس وقت ساقط ہوگا جب ہم عملی طور پر ''اہم'' کی بجا آوری میں مشغول ہو جائیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر ہم نہ ''اہم'' بجالائیں اور نہ ''غیر اہم'' بلکہ دونوں سے دست بردار ہوکر سو رہیں تو کیا ہم صرف ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور وہ اہم واجب کی نافرمانی ہے لیکن ''غیر اہم'' واجب کا ترک گناہ نہیں ہے کیونکہ اس کا وجوب ساقط ہو چکا ہے، یا ہم دو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ ''غیر اہم'' کا وجوب تو اس وقت ساقط ہوگا جب ہم ''اہم'' واجب کی بجا آوری میں عملی طور پر مشکول ہو جائیں، اب جبکہ دونوں کو چھوڑ کر سو گئے ہیں تو دو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں؟

مثلاً دو شخص ڈوبنے کے قریب ہیں، ہمارے لیے دونوں کو بچانا ممکن نہیں

ہے،صرف ایک ہی کو بچا سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک متقی، پرہیزگار اور خدا کے بندوں کا خدمت گزار ہے اور دوسرا فاسق وموذی ہے لیکن بہرحال اس کی جان بھی محترم ہے۔

فطری سی بات ہے ہم اس مومن، پرہیزگار اور خدمت گزار کو ترجیح دیں گے جس کا وجود خلق خدا کے لیے مفید ہے یعنی اس کی نجات ''اہم'' اور دوسرے کو بچانا ''غیر اہم'' ہے۔

اب اگر ہم نے نافرمانی کرتے ہوئے لاپرواہی برتی اور وہ دونوں ڈوب گئے تو کیا ہم دو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور دو آدمیوں کے خون میں شریک ہیں یا صرف ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یعنی صرف اس مومن شخص کی موت کے ذمہ دار ہیں اور اس دوسرے کی ہلاکت میں ہماری کوئی تقصیر نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی کام دو مختلف جہتوں سے واجب بھی ہو اور حرام بھی؟ البتہ یہ ناممکن ہے کہ ایک یہ کام ایک ہی جہت سے واجب بھی ہو اور حرام بھی مثلاً یہ ناممکن ہے کہ دوسروں کے مال میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف اس حیثیت سے کہ وہ دوسروں کے مال میں تصرف ہے واجب بھی ہو اور حرام بھی۔ لیکن اگر حیثیتوں میں فرق ہو تو اس وقت کیا حکم ہے؟ مثلاً غصبی زمین پر نماز کی بجا آوری، (اس سے قطع نظر کہ شارع نے نماز کے لیے زمین کا مباح ہونا شرط قرار دیا ہے) ایک جہت سے دوسرے کے مال میں تصرف ہے کیونکہ دوسرے کی زمین میں نقل وحرکت بلکہ دوسرے کی زمین پر قیام کرنا بھی اس کے مال میں تصرف ہے۔ دوسری جہت سے مخصوص شکل میں اعمال کی بجا آوری نماز کا عنوان

اختیار کر لیتی ہے۔ آیا یہ ممکن ہے کہ یہ علم اس جہت سے کہ نماز ہے واجب ہو اور اس جہت سے کہ غیر کے مال میں تصرف ہے حرام ہو؟

یہ عقل ہی ہے جو ان چاروں مسئلوں میں سے نہایت دقیق حساب وکتاب کے ذریعہ واقعی فریضہ کو واضح کرسکتی ہے۔ اصولیوں نے ان چاروں مسائل کے بارے میں بڑی عمیق بحث کی ہے۔

ان چار مسئلوں میں سے پہلا مسئلہ مقدمۂ واجب، دوسرا مسئلہ **امر بالشی مقتضی نہی عن الضد**، تیسرا مسئلہ ترتب اور چوتھا مسئلہ اجتماع امر ونہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چوتھے درس سے جو باتیں اب تک بیان ہوئیں ان سے یہ معلوم ہو گیا کہ علم اصول کے مسائل مجموعی طور پر دو قسم کے ہیں۔ ایک حصہ ''استنباطی اصول'' اور دوسرا حصہ ''عملی اصول'' سے تعلق رکھتا ہے۔ استنباطی اصول کے حصہ کی بھی دو قسمیں ہیں، نقلی وعقلی۔ نقلی حصہ میں کتاب، سنت اور اجماع کی تمام بحثیں شامل ہیں لیکن عقلی حصہ صرف عقل سے تعلق رکھتا ہے۔

سبق نمبر ۷

عملی اصول

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ شرعی حکم کے استنباط کے لیے فقیہ، چار مصادر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ فقیہ اپنی اس تحقیق میں کبھی کامیاب ہوجاتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہوتا، یعنی کبھی (البتہ غالباً) یقین یا معتبر ظن (یعنی جس ظن کو شارع نے معتبر قرار دای ہے) کی شکل میں شریعت کے واقعی حکم تک پہنچ جاتا ہے اور اس کو فریضہ معلوم ہوجاتا ہے یعنی اسے یقین ہوجاتا ہے یا معتبر ظن حاصل ہوجاتا ہے کہ شارع اس سے کیا چاہتے ہیں لیکن بعض اوقات وہ مایوس و ناکام ہوجاتا ہے یعنی خدا کے حکم اور اپنے فریضہ کو کشف نہیں کر پاتا۔ حیران وسرگرداں رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ آیا عقل یا شریعت یا دونوں نے ایسے مقام پر اس کے لیے کوئی فریضہ معین کیا ہے یا نہیں؟ اگر معین کیا ہے تو وہ کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہاں شارع نے ایک فریضہ معین کیا ہے۔ یعنی ایسے حالات کے لیے اس نے کچھ اصول وضوابط معین کیے ہیں۔ بعض جگہوں پر عقل بھی حکمِ شریعت کی تائید کرتی ہے۔ یعنی عقل کا مستقل حکم بھی بعینہ وہی ہے جو شریعت کا حکم ہے اور کچھ دوسرے مقامات پر عقل کم از کم خاموش ہے یعنی اس کا اپنا کوئی

مستقل حکم نہیں ہے بلکہ وہ شریعت کے تابع ہے۔

علم اصول، استنباطی اصول کے شعبہ میں ہمیں واقعی احکام کے صحیح استنباط کا طریقہ سکھاتا ہے اور ''عملی اصول'' کے شعبہ میں ان اصول وضوابط سے استفادہ اور ان کے صحیح نفاذ کی روش سکھاتا ہے جو ان حالات کے لیے وضع ہوئے ہیں۔

چار عملی اصول

کلی عملی اصول جو فقہ کے تمام ابواب میں استعمال ہوتے ہیں چار ہیں:

۱۔ برائت

۲۔ احتیاط

۳۔ تخییر

۴۔ استصحاب

ان چار اصولوں میں ہر ایک کے استعمال کا ایک خاص موقع ہے جن کی پہچان ضروری ہے۔ لیکن پہلے ہم ان چار اصولوں کی تعریف پیش کرتے ہیں۔

اصل برائت: یعنی اصل یہ ہے کہ ہم بری الذمہ ہیں اور ہمارا کوئی فرض نہیں ہے۔

اصل احتیاط: یعنی اصل یہ ہے کہ ہم احتیاط کے مطابق اس طرح عمل کریں کہ اگر واقع اور ''نفس الامر'' میں ہمارا کوئی فریضہ رہا ہو تو ہم نے اسے انجام دے لیا ہو۔

اصل تخییر: یعنی اصل یہ ہے کہ ہمیں اختیار ہے کہ دو امور میں سے جسے چاہیں انتخاب کر لیں۔

اصل استصحاب: یعنی اصل یہ ہے کہ جو کچھ تھا اپنی پہلی حالت پر باقی ہے اوراس کے برخلاف کوئی چیز رونما نہیں ہوئی ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کہاں اصل برائت جاری کی جاسکتی ہے اور کہاں کہاں اصل احتیاط اصل تخییر یا اصل استصحاب جاری کی جاسکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص محل و مقام ہے اور علم اصول ہمیں ان مخصوص مقامات سے آشنا کراتا ہے۔

اصولی کہتے ہیں: اگر ہم شرعی حکم استنباط نہ کرسکے اور اپنے فریضہ کے تشخیص سے عاجز رہ گئے اور شک وتردد کی حالت میں مبتلا ہوئے تو ایسی صورت میں ہمارا یہ شک یا تو اجمالی علم کے ہمراہ ہے یا نہیں۔ مثلاً ہمیں شک ہے کہ امامؑ کی غیبت کے زمانہ میں جمعہ کے دن نماز جمعہ واجب ہے یا نماز ظہر؟ پس ہمیں نماز جمعہ کے وجوب میں بھی شک ہے اور نماز ظہر کے وجوب میں بھی، لیکن اتنا اجمالی علم بھی ہے کہ ان دو میں سے ایک، یقیناً واجب ہے۔ لیکن کبھی شک اس طرح کا ہوتا ہے کہ عصر غیبت میں نماز عید فطر واجب ہے یا نہیں؟ یہاں ہمارا شک ''بدوی شک'' ہے۔ اجمالی علم کے اطراف میں شک نہیں ہے۔

پس اپنے فریضہ میں شک یا اجمالی علم کے ہمراہ ہے یا بدوی شک ہے۔ اجمالی علم کے ہمراہ ہونے کی صورت میں یا وہ ممکن الاحتیاط ہوگا یعنی دونوں کو انجام دینا ممکن ہوگا یا احتیاط کا امکان نہ ہوگا۔ اگر احتیاط ممکن ہو تو احتیاط کرتے ہوئے دونوں کو بجالانا چاہیے۔ یعنی یہاں اصل احتیاط کا مقام ے اور اگر احتیاط ممکن نہ کیونکہ امر دو محذوروں یعنی وجوب وحرمت کے درمیان دائر ہے ایک معین امر کے

بارے میں نہیں معلوم کہ وہ واجب ہے یا حرام۔ مثلاً ہم نہیں جانتے امامؑ کی غیبت کے زمانہ میں بعض فرائض کی بجا آوری امامؑ کا خاصہ ہے اور ہمارے لیے ان کی بجا آوری حرام ہے یا امامؑ سے مخصوص نہیں ہے ہم پر بھی واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقام پر احتیاط کا راستہ بند ہے۔ پس یہ اصل تخییر کا مقام ہے اور ہمارا شک بدوی شک ہوا اجمالی علم کے ہمراہ نہ ہو۔ اس صورت میں یا تو اس کی گزشتہ حالت معلوم ہوگی اور شک اس حالت کے باقی رہنے میں ہوگا۔ اور یا اس کی گزشتہ حالت بھی معلوم نہ ہوگی۔ اگر گزشتہ حالت معلوم ہے تو یہاں اصل استصحاب جاری کیا جائے گا اور اگر گزشتہ حالت معلوم نہ ہو تو اصل برائت جاری ہوگی۔

ایک مجتہد میں مشق وممارست کے زیر اثر، ان چار اصولوں کے اجراء کے محل و مقام کی تشخیص کی صلاحیت وتوانائی بدرجۂ اتم موجود ہونی چاہیے ورنہ وہ خطا ولغزش کا شکار ہوجائے گا کیونکہ بعض اوقات محل و مقام کی تشخیص کے لیے بہت زیادہ چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان چار اصولوں میں سے اصل استصحاب، خالص شرعی ہے یعنی اس کے بارے میں عقل کوئی مستقل حکم نہیں رکھتی بلکہ وہ تابع شریعت ہے۔ بقیہ تین اصلیں عقلی ہیں جن کی شریعت نے بھی تائید کی ہے۔

استصحاب کی دلیلیں کچھ معتبر حدیثیں ہیں جو ان لفظوں میں بیان ہوئی ہیں: لا تنقض الیقین بالشك یعنی اپنے یقین کو شک کے ذریعہ نقض نہ کرو۔ خود حدیث کے متن اور اس کے سیاق وسباق سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ اس حدیث سے وہی مراد ہے جسے اصولی فقہاء استصحاب کہتے ہیں۔ اصل برائت کے

سلسلہ میں بھی بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن میں مشہورترین حدیث ''حدیث رفع'' ہے۔

''حدیث رفع'' رسول اکرمؐ کی یہ مشہور حدیث ہے کہ حضرت نے فرمایا:

رفع عن امتی تسعة: مالایعلمون، وما لایطیقون، وما استکرهوا علیه وما اضطروا الیه، والخطاء والنسیان والطیریة، والحسد، والوسوسة فی التفکر فی الخلق۔

نو چیزیں ہماری امت پر سے اٹھالی گئی ہیں: جو چیز وہ نہیں جانتے، جس کی ان میں طاقت نہیں، جس پر وہ مجبور کیے گئے ہوں، جس چیز کے لیے مضطرومجبور ہوں، لہو، نسیان، بدشگونی، حسد، (جب تک عملی مرحلہ میں داخل نہ ہوا ہو۔ یا محسود واقع ہونا) امرتخلیق میں شیطانی وسوسے۔

اصولیوں نے اس حدیث اور اس کے ہر جملے کے بارے میں بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ البتہ اس برائت کے لیے شاید وہی پہلا جملہ ہے جس میں حضرتؐ فرماتے ہیں جو چیز میری امت نہیں جانتی اور اس کا حکم ان تک نہیں پہنچا ہے اس سے وہ بری الذمہ ہے۔

یہ چار اصول شرعی احکام کے سمجھنے کے لیے صرف مجتہدوں ہی سے مخصوص نہیں ہیں۔ موضوعات میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور مقلدین بھی مرحلہ عمل میں موضوعات میں شک کے وقت ان اصول سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

فرض کیجیے ایک بچہ شیرخوارگی کے وقت ایک دوسری عورت سے چند مرتبہ دودھ پیتا ہے۔ بعد میں یہی بچہ بڑا ہوکر اس عورت کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہاں ایسے میں نہیں معلوم کہ آیا اس عورت کا اتنا دودھ پیا ہے کہ اس عورت اور اس کے شوہر کا رضاعی فرزند بن گیا ہے؟ یعنی اس نے پندرہ مرتبہ پے درپے، یا ایک دن اور ایک رات پے درپے یا اتنا دودھ پیا ہے کہ اسی دودھ سے اس کے بدن میں گوشت بنا ہے؟ یہاں اصل استصحاب کے جاری ہونے کا موقع ہے کیونکہ بچہ، اس عورت کا دودھ پینے سے پہلے اس کا رضاعی فرزند نہیں تھا، اب یہ شک ہو رہا ہے کہ یہ بچہ اس کا رضاعی فرزند ہوا یا نہیں؟ استصحاب کریں گے کہ وہ اپنی اسی پہلی حالت پر باقی ہے اور اس کا رضاعی نہیں ہوا ہے۔

اگر ہم باوضو تھے اور آنکھ جھپک گئی، اب شک کررہے ہیں کہ کیا ہم واقعاً سو گئے تھے (اور اس طرح وضوٹوٹ گیا)؟ تو وضو کے باقی رہنے کا استصحاب کریں گے۔ اگر ہمارا ہاتھ پاک تھا اور اس کے نجس ہونے کا شک ہوگیا تو اس کی طہارت کا استصحاب کریں گے۔ اور اگر پہلے نجس تھا بعد میں یہ شک کریں کہ اسے پاک کیا ہے یا نہیں تو یہاں اس کی نجاست کا استصحاب کریں گے۔

اگر کوئی سیال چیز ہمارے سامنے ہو اور شک کریں کہ اس میں الکحل ہے یا نہیں۔ (جیسے بعض دوائیں) تو اصل یہ ہے کہ ہم بری الذمہ ہیں، یعنی اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر دوا کی دوشیشیاں ہوں اور یہ یقین ہو کہ ایک میں الکحل موجود ہے یعنی ان میں سے ایک الکحل کی موجودگی کا، اجمالی علم ہو، تو یہ اصل احتیاط کا مقام ہے۔

فرض کریں کہ صحرا میں ایک ایسے دوراہے پر پہنچ جاتے ہیں جہاں رکنے یا ان میں سے کسی ایک راستہ پر چل دینے کا لازمہ جان کا خطرہ ہے لیکن یہ بھی یقین ہے کہ ان میں سے ایک راستہ ایسا بھی ہے جو ہمیں نجات دلا سکتا ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ ان دو میں سے وہ کون سا راستہ ہے جو ہمیں نجات دلا سکتا ہے اور وہ کون سا راستہ ہے جو ہمارے لیے خطرناک ہے اور فرض یہ ہے کہ یہاں ٹھہرے رہنے میں بھی خطرہ ہے۔ ایک طرف سے جان کا بچانا واجب ہے دوسری طرف سے جان کو خطرے میں ڈالنا حرام ہے۔ پس ہمارا امر دو محذوروں کے درمیان دائر ہے اور ہمیں اختیار ہے کہ ان دو میں سے جسے چاہیں انجام دیں۔